اردو تاریخ گوئی کی روایت اور داغ دہلوی

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام☆

Abstract

The composition of chronograms (Tareekh Goi) is an art based on numerical value of the letters. In 19th century it was so popular that almost every poet was not only well versed in it but also composed it in Persian, Arabic and Urdu languages to prove his poetic excellence. A famous Urdu poet Dagh Dehlvi also composed chronograms and rendered more than two hundred chronograms. The chronograms of Dagh are found in his three Diwans and various published and unpublished books. This article deals with this art form with special reference to Dagh Dehlvi's.

کسی واقعہ کے تاریخی وقوع کو الفاظ میں اس طرح بیان کرنا کہ ان الفاظ کے حروف کے متعینہ اعداد سے مطلوبہ واقعہ کا سال وقوع ظاہر ہو، اصطلاحاً اسے تاریخ کہا جاتا ہے اور یہ عمل تاریخ گوئی کہلاتا ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس میں حروف اعداد کی قیمت متعین کرتے ہیں اور اس فن کا ماہر حروف یا الفاظ کی مدد سے لمحات گریز اں کو اس انداز میں نقش دوام عطا کرتا ہے کہ وہ ایک سالِ مطلوب ہی نہیں رہتا بلکہ ایک گہری تہذیبی معنویت کا حامل بھی بن جاتا ہے۔ ممکن ہے آج اس فن کو فعل عبث اور وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہو لیکن ایک وقت وہ بھی تھا جب ایک اچھے تاریخ گو کو بڑی قدر و منزلت حاصل ہوتی تھی اور معاشرے میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ ہر مشق اور استاد شاعر کے لیے اس فن سے کما حقہ واقفیت ضروری سمجھی جاتی تھی۔

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، ملتان

اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے فطری ذہانت ،خداداد صلاحیت ، ذہن رسا،علم ریاضی میں خاطر خواہ قابلیت، مسلسل مشق اور شب و روز کا ریاض درکار ہوتا تھا۔تاریخ گوئی کسی بھی شخص کی استادی، طباعی ، ذہانت ،علم وفضل اور کاوش فکر کا ایسا امتحان ہوتا تھا جس میں کامیابی کا سہرا کسی کسی کے سر بندھتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس بحر بیکراں میں ماہر پیراک حوصلہ ہارتے اور اس صحرائے بسیط میں بڑے بڑے خضر راہ گم کرتے نظر آتے ہیں لیکن ایسے مشاق شعرا کی ، کسی بھی دور میں کمی نہیں رہی (حتیٰ کہ آج کے دور میں کہ جب اسے وقت کا ضیاع تصور کرنے والوں کی بھی کمی نہیں) جن کے ہاتھوں میں یہ فن ہنر وری کے اعلیٰ نمونوں میں ڈھل کر معجزانہ خلاقی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ادھر کوئی واقعہ رونما ہوا،اُدھر اس کی تاریخ کہہ دی۔ یہاں تک کہ اپنی قابلیت اور استادی کا اظہار اس حد تک کیا جاتا کہ گفتگو بھی تاریخی کرتے۔منشی فدا علی فارغ عموماً گفتگو کرتے تو تاریخی جملے بولتے ۔ ایک مرتبہ محکمۂ مدار المہامی میں دو گھنٹے تک گفتگو تاریخی کرتے رہے اور سوال وجواب بھی تاریخی جملوں میں ادا کیا۔(۱)

تاریخ گوئی کی روایت کے نقوش کئی صدیوں پر محیط ہیں۔ فارسی اور عربی میں تو اس کی روایت خاصی قدیم ہے لیکن اردو میں اس کے اولین نقوش دسویں صدی ہجری میں دیکھنے میں آئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے گجرات کے رائے کھیڑ احمد آباد کی مسجد کے کتبے پر کندہ اردو کی ایک معنوی (۲) تاریخ کی نشاندہی کی ہے (۳) جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو تاریخ گوئی کے نقش پچھلی صدی تک پھیلے ہوئے ہیں۔جنوبی ہند وہ سرزمین ہے جہاں اول اول اردو تاریخ گوئی نے زور پکڑا۔بیجاپور میں نصرتی وہ پہلا تاریخ گو ہے جس نے باقاعدہ، تسلسل کے ساتھ اور مکمل اردو تاریخیں کہیں اگر چہ اس کی زیادہ تاریخیں تو ہمدست نہیں ہوئیں لیکن جتنی بھی تاریخیں دستیاب ہوئی ہیں۔ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اردو کا پہلا باقاعدہ تاریخ گو شاعر کہا جاسکتا ہے۔(۴) شمالی ہند میں بھی اردو تاریخ گوئی کے نقوش دسویں صدی ہجری میں دیکھے جاسکتے ہیں (۵) لیکن شمالی ہند میں اردو تاریخ گوئی کا فروغ اٹھاریں صدی کے اواخر میں ہوا جس نے انیسویں صدی میں ایک رواج یا فیشن کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے قابل ذکر شعرا میں تاباں ،سوداؔ، قائمؔ ،میر محمد محسنؔ ،جعفر علی خان

حسرتؔ، محبت خان محبتؔ، فخر الدین ماہرؔ اور مائلؔ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں جن شعرا نے اردو تاریخ گوئی کی روایت کو آگے بڑھایا ان میں مصحفیؔ، انشاؔ، جراتؔ، اور رنگینؔ قابل ذکر شعرا ہیں۔ ان شعرا نے ایک طرف اردو شاعری میں اپنی تخلیقی قابلیت کا لوہا منوایا تو دوسری طرف نادر تاریخیں کہہ کر اس صدی کے اولین تاریخ گو شعرا میں شمار ہوئے۔ اگر چہ ان شعرا نے کثیر تعداد میں اردو تاریخیں تو نہیں کہیں لیکن انیسویں صدی کے وسط میں اردو تاریخیں کہنے والوں کی ایک کثیر تعداد ان کے تلامذہ یا ان تلامذہ کے شاگردوں کی نظر آتی ہے۔ اس عہد میں جن اردو تاریخ گو شعرا نے مقبولیت حاصل کی ان میں مومنؔ، مجروحؔ، حاتم علی بیگ مہرؔ، قربان علی بیگ سالکؔ، ناسخؔ، قدرؔ بلگرامی، منیرؔ شکوہ آبادی، ظہورؔ دہلوی، مظفر علی اسیرؔ، منشی انوار حسین تسلیمؔ سہسوانی، جوؔیا مرادآبادی، ضامن علی جلالؔ، امیر اللہ تسلیمؔ، امیرؔ مینائی اور داغؔ دہلوی قابل ذکر شعرا ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں شمالی ہند ایک ایسا خطہ ء زمین تھا جہاں تاریخ گوئی نے ایک فیشن کی صورت اختیار کر لی تھی۔ شاعر کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ وہ تاریخ گو بھی ہو۔ اگر کوئی شاعر تاریخ نہ کہہ سکتا ہو تو اس کی شاعرانہ صلاحیت مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ اس عہد میں جب تاریخ گوئی کا شوقِ فراواں شمالی ہند کی تہذیبی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا، داغؔ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ تاریخ گوئی کے فن میں بھی مشق بہم پہنچائی اور اس میں اس درجہ مہارت حاصل کی کہ انھوں نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ دور دور سے انھیں تاریخوں کی فرمائشیں آتیں۔

داغؔ کی تاریخ گوئی کے ارتقا پر سرسری نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھیں اس فن سے فطری لگاؤ نہیں تھا۔ انھوں نے اس فن میں مسلسل مشق اور ریاضت سے اتنی صلاحیت پیدا کر لی تھی کہ بر جستہ اور برمحل تاریخیں کہنا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہ رہا تھا۔ داغؔ نے ۱۸۴۵ء کے قریب شاعری شروع کی (۶) اور رامپور کی ملازمت سے مستعفی ہونے (۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء) تک (۷) بیالیس سالہ دور میں صرف چند تاریخیں کہیں۔ ان میں سے دو تاریخیں پہلے دیوان 'گلزارِ داغ' اور کچھ 'مہتاب داغ' میں موجود ہیں۔ مثنوی 'فریاد داغ' تاریخی نام بھی اسی عرصے میں رکھا۔ ممکن ہے اسکے علاوہ دو چار

تاریخیں اور بھی کہی ہوں۔ دہلی کے قیام کے دوران بھی انھوں نے ایک دیوان تیار کیا تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔(۸) ممکن ہے اس میں بھی کچھ تاریخیں موجود ہوں۔

تیس سال دربار رامپور سے وابستہ رہ کر بھی جہاں امیر، اسیر، جلال اور منیر جیسے تاریخ گو شعرا موجود تھے، داغ نے قابلِ ذکر تعداد میں تاریخیں نہیں کہیں۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ داغ اپنے اندر تاریخ گوئی کا وہ مذاق اور طبعی مناسبت نہیں پاتے تھے جس کے باعث انھیں تاریخ گوئی کی طرف رغبت ہو پاتی۔ یا ممکن ہے وہ شاعری کے زور پر ہی اپنا مقام بنانا چاہتے ہوں اور تاریخ گوئی کا فن ان کی ترجیحات میں شامل نہ رہا ہو۔ شاید اسی وجہ سے انھوں نے قلعہ معلی کی زبان میں شاعری کے سہارے ہی اپنا مقام بنانے کی کوشش کی۔ اس مؤقف کی تائید ڈاکٹر اعجاز حسین کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ 'داغ کو زبان و بیان کی صفائی وصنائع سے وہ مقبولیت ہوئی کہ ان کے زمانے کے زیادہ تر شعرا ان ہی کی روش پر چلنے لگے حتیٰ کہ امیر مینائی سا مقدس ویر گو شاعر اسی کوشش میں نظر آنے لگا۔۔۔ جلال، اسیر، منیر وغیرہ سب ہی کے یہاں شعوری یا غیر شعوری تقلید داغ کی نظر آتی ہے۔'(۹) رام پور میں داغ کے علاوہ راسخ دہلوی، ظہیر دہلوی اور مرزا حیا دہلوی جیسے شعرا بھی موجود تھے لیکن داغ کے مقابلے میں انھیں برتری حاصل نہ تھی۔ یہاں داغ کو ہی دہلوی شاعری کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔(۱۰) نواب کلب علی خان کی وفات ۲۳/ مارچ ۱۸۸۷ء کے بعد رامپور کے حالات سازگار نہ رہے۔ داغ کا درج ذیل شعر اسی بات کی تائید پیش کرتا ہے۔

رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغ مزے سارے تھے وہ خلد آشیاں تک (۱۱)

چنانچہ ۲۸/ دسمبر ۱۸۸۷ء کو داغ رامپور کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔(۱۲) جنوری تا مارچ ۱۸۸۸ء تک انھوں نے امرتسر، کشن کوٹ، اجمیر، آگرہ، علی گڑھ، متھرا اور جے پور وغیرہ شہروں کے سفر کیے۔ ان حالات میں ان کو حیدرآباد ہی ایسا مقام نظر آیا جہاں انھیں رامپور کی طرح سکون میسر آ سکتا تھا۔ چنانچہ قسمت آزمائی کے لیے ۷/ اپریل ۱۸۸۸ء کو داغ حیدرآباد پہنچے۔(۱۳)

دلی سے چلو داغ کرو سیر دکن کی گوہر کو ہوئی قدر سمندر سے نکل کر (۱۴)

داغ جس وقت حیدر آباد پہنچے ان دنوں وہاں کے حالات بہتر نہ تھے۔حیدر آباد سیاسی اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔لوگوں کو مختلف پارٹیوں سے وابستہ ہونا پڑتا تھا۔اس صورت حال میں انھوں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے صلح جویانہ رویہ اختیار کیا اور کسی بھی گروہ سے واضح وابستگی اختیار کر کے دوسرے گروہ کو اپنا مخالف نہ بنایا۔تقریباً تین سال دربار میں حاضری کے لیے کوششیں کرتے رہے۔اسی دوران بنگلور، بمبئی اور دہلی میں قیام بھی رہا۔آخر کار ۶/فروری ۱۸۹۱ء میں انھیں دربار نظام میں حاضری کا موقع ملا۔(۱۵)

دربار اس عہد کی سماجی زندگی میں خاص اہمیت کا حامل تھا۔عوام سے خواص تک ہر شخص کی نظریں دربار پر لگی ہوتی تھیں۔درباروں کی تہذیبی روایات کے اثرات ان سے وابستہ شرفا، امرا،شعرا اور دیگر طبقات پر پڑ رہے تھے۔دربار قلعے کی تقلید اور نقالی کر رہا تھا اور ان سے وابستہ امرا، شرفا اور شعرا دربار کی نقالی میں مصروف تھے۔مغلیہ درباروں سے بڑے بڑے تاریخ گو شعرا وابستہ رہے اور انعام و اکرام حاصل کرتے رہے۔یہی روایت قلعے سے ہوتی ہوئی ہندوستان کے دیگر ریاستی درباروں تک پہنچی۔اب درباروں سے وابستہ ہونے کے لیے صرف شاعری ہی کافی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ گوئی کی صلاحیت بھی درکار ہوتی تھی۔شعرا، اپنے ہم چشم اور ہم عصر شعرا سے ممتاز ہونے کے لیے بھی اس فن کا سہارا لے رہے تھے۔اس فن میں قصیدے کی جملہ صفات بھی موجود تھیں۔اس طرح یہ فن قصیدے کا نعم البدل بھی ثابت ہو رہا تھا۔یہی وجہ ہے کہ دربار سے وابستہ کم و بیش تمام شعرا شاعری کے ساتھ ساتھ اس فن میں بھی مہارت رکھتے تھے۔چنانچہ نواب نظام سے رابطہ استوار کرنے کے لیے داغ کو شاہی تقاریب میں قصائد اور قطعات کے ساتھ ساتھ تاریخیں بھی پیش کرنا پڑیں۔

ان دنوں حیدر آباد میں تراب علی زور جیسے باکمال تاریخ گو موجود تھے جن کی تاریخوں کا ڈنکا اس عہد میں بج رہا تھا۔ایسی صورت حال میں ان کے سامنے داغ کی تاریخ گوئی کا چراغ کیسے جل سکتا تھا۔داغ ابھی اس فن میں نو آموز تھے اور اس عہد میں جس طرح نت نئے انداز میں تاریخیں کہی جا رہی تھیں اس طرح کی تاریخیں کہنے کی صلاحیت وہ اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔اسی وجہ سے داغ کی

تاریخوں پر پھبتیاں کسی گئیں اور ان کی تاریخوں کا مذاق اڑا گیا۔(۱۶) پیچیدہ، نادر اور محیر العقول تاریخیں کہنے کے لیے جس طرح کی طبعی مناسبت اور ذہنی مشق کی ضرورت تھی، وہ داغؔ اپنے اندر نہ پاتے تھے اور نہ ہی ان کا ذہن اس طرح کے خشک اور غیر شاعرانہ عمل کو پسند کرتا تھا۔ انھوں نے شاعری میں جس انداز کو برتا وہی انداز تاریخ گوئی میں بھی اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد میں ابتدا میں ان کی تاریخوں کو پسند نہیں کیا گیا اور ان پر پھبتیاں کسی گئیں چونکہ داغؔ نے آسان اور بول چال کی زبان میں تاریخیں کہہ کر تاریخ گوئی کی روایت میں نئے انداز کو برتا تھا اور یہ انداز وہاں کے تاریخ گو شعرا کے لیے نیا اور غیر معروف تھا اس لیے داغؔ کی تاریخوں کو اہمیت نہ دی گئی۔

داغؔ کی تاریخیں جو ان کے تین دواوین 'گلزار داغؔ'، 'مہتاب داغ' اور 'یادگار داغ' میں موجود ہیں ان کی تعداد بالترتیب ۲، ۷۳، اور ۳۴ ہے جن کی مجموعی تعداد ۱۰۹ بنتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی تاریخیں انھوں نے اپنے ہم عصر شعرا کے دواوین کی اشاعت کے لیے کہیں۔ کالی داس گپتا رضا کا خیال ہے کہ اگر کاوش کی جائے تو ان کی تعداد بآسانی سوا سو تک پہنچ سکتی ہے۔(۱۷) شعرا کے دواوین اور تصانیف کی اشاعت، تکمیل اور ترتیب کی تمام تاریخوں کو اگر جمع کرلیا جائے تو راقم الحروف کے خیال میں ان کی تعداد یقیناً دوسو کے قریب پہنچ جائے گی۔(۱۸) اور اکبر علی خاں افسوںؔ کی اس روایت 'شکار گاہ میں اُدھر (کذا) شیروں پر گولیاں چلتی تھیں ادھر تاریخوں کی بھرمار ہوتی۔۔۔شاہ آصف نے شیر مارے دو، ایسے ایسے بہت سے مادے ہیں'(۱۹) کو مبالغہ نہ جانیں تو ان کی تعداد تین سو سے بھی زائد ہوجائے گی۔

تمکین کاظمی نے اپنی تصنیف 'داغؔ' میں داغؔ کو بحیثیت تاریخ گو خاص اہمیت نہیں دی۔ ان کے خیال میں 'داغؔ' استاد ضرور تھے مگر فن تاریخ گوئی میں انھیں کوئی خصوصیت حاصل نہیں تھی کیونکہ انھیں حساب سے دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے (ان سے) تاریخیں بھی اچھی نہ نکل سکتی تھیں (۲۰) انھوں نے مثال میں جو دو تاریخیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

داغ کی تم زبان سے سن لو　　　ایک ہفتے کا ہے حساب شکار

کہی گنتی کی ایک ہی تاریخ   شاہ آصف نے شیر مارے دو (۲۱)

مندرجہ بالا تاریخ کو اچھی تاریخ نہ سمجھنا فن تاریخ گوئی سے عدم واقفیت کی غماز ہے۔ اگر چہ اس تاریخ میں اس عہد کی مروجہ روایت کے مطابق داغ نے کوئی پیچیدہ صنعت استعمال نہیں کی اور نہ اس تاریخ میں کوئی ذہنی مشق کے نتیجے میں حاصل ہونے والی مصنوعیت نظر آتی ہے لیکن اس مادہء تاریخ میں برجستگی، روانی اور صفائی زبان سے سہل ممتنع کی سی جو کیفیت پیدا ہوگئی ہے اس نے تاریخ کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ تاریخ گوئی کی روایت کا مطالعہ کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بیشتر تاریخیں گنجلک زبان میں کہی گئی ہیں اور ان تاریخوں میں شعوری کوشش، مصنوعیت پن اور آورد کا گمان ہوتا ہے۔ برجستہ، رواں اور بول چال کی زبان میں کہی گئی تاریخیں بہت کم کہی گئی ہیں۔ انیسویں صدی کی تاریخ گوئی کی روایت پر نظر ڈالیں یہ صلاحیت بہت کم تاریخ گو شعرا میں نظر آتی ہے۔ شاعری کی حوالے سے داغ کا نقطہء نظر یہ تھا کہ زبان و بیان میں ندرت ہو، بول چال کی زبان کے قریب ہو اور کوئی بات بغیر محاورہ کے نہ کہی جائے۔ یہی خصوصیت ان کی تاریخوں میں نظر آتی ہے۔

تمکین کاظمی کا یہ خیال کہ داغ کو فن تاریخ گوئی میں کوئی خصوصیت حاصل نہیں، درست نہیں۔ داغ کو تاریخ گوئی کی روایت میں دو وجہ سے خصوصیت حاصل ہے۔ پہلی یہ کہ داغ نے تاریخوں اور بالخصوص مادۂ تاریخ میں زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے۔ داغ کی تاریخیں زبان و بیان کے عیوب سے پاک ہوتی ہیں اور دوسری یہ کہ وہ شمالی ہند کے ان معدودے چند تاریخ گو شعرا میں سے ہیں جنھوں نے اردو میں کثیر تعداد میں تاریخیں کہیں ان دو خوبیوں کی وجہ سے داغ کو اردو تاریخ گوئی کی روایت میں خاص مقام حاصل ہے۔

جس طرح شاعری میں استادی شاگردی کی قدیم روایت موجود ہے۔ اس طرح کی روایت کا سراغ تاریخ گوئی کی تاریخ میں ماسوا دو تین مثالوں کے نہیں ملتا۔ تاریخ گوئی کی روایت میں اصلاحِ تاریخ کے نمونے بہت ہی کم ملتے ہیں۔ تذکروں اور تاریخوں میں شاید ہی کہیں ایسی بات کا ذکر ہوا ہو کہ فلاں استاد نے اپنے کسی شاگرد کی تاریخ پر اصلاح دی ہے۔ اسی وجہ سے اردو میں تاریخوں کے

اصلاحی نمونے کمیاب ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ تاریخ کہنا ایک دقت طلب کام ہے۔ تاریخ کہنے کے لیے جس مشاقی اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ استاد شعرا ایسے نو آموز شعرا کے کلام پر اصلاح دیا کرتے تھے جو ابھی اس فن میں خام ہوتے تھے۔ مزید یہ کہ شاعری میں اصلاح کے لیے مضامین اور الفاظ کا کھلا میدان ہوتا ہے۔ استاد شاعر کسی بھی لفظ یا مضمون کو بآسانی تبدیل کرسکتا تھا جب کہ تاریخوں میں اصلاح دینے کے لیے یہ آسانیاں موجود نہیں ہوتیں۔ مادہ ٔ تاریخ میں کسی بھی لفظ کو تبدیل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ پھر اسی لفظ کے متبادل ایسا لفظ لانا پڑتا ہے جس سے شعر کا وزن اسی بحر کے مطابق رہے اور جس کے عدد تبدیل شدہ لفظ کے برابر بھی ہوں اور اگر پورے مصرع میں قطع برید کی جائے تو یہ از سر نو تاریخ کہنے کے مترادف بات ہوتی تھی۔ یہ اس سے بھی زیادہ مشکل کام تھا۔ علاوہ ازیں یہ کہ تاریخیں وہی شعرا کہتے تھے جو شعر کہنے کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے اور شاعری میں پختہ ہو چکے ہوتے تھے۔ ایسا شاعر تاریخ کہنے کی کوشش ہی نہیں کرتا تھا جو شعر کہنے کی ابتدائی مشق میں مصروف ہو۔ اسے پہلے شعر کہنے میں مہارت درکار ہوتی تھی تب کہیں جا کر وہ تاریخ کہنے کے لیے دماغ سوزی کرسکتا تھا۔ اسی وجہ سے استاد شعرا کی نو آموز تاریخ گو شعرا کی تاریخوں پر اصلاح کے نمونے کمیاب ہیں اور تاریخوں پر اصلاح دینے والے استاد نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے۔ داغؔ کو تاریخ گوئی کی روایت میں یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کی تاریخوں پر اصلاح دیا کرتے تھے۔(۲۲) تاریخوں پر اصلاح وہی شخص دے سکتا ہے جو خود تاریخ کہنے کی اچھی خاصی مشق رکھتا ہو۔ جو شخص خود مشقت سے تاریخ کہتا ہو وہ دوسروں کی تاریخوں پر کیا اصلاح دے گا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں داغؔ اور امیرؔ دو ایسے شاعر نظر آتے ہیں جو اپنے شاگردوں کی تاریخوں پر اصلاح دیا کرتے تھے۔(۲۳)

داغؔ نے تاریخ گوئی کا باقاعدہ آغاز اپنے حیدر آباد قیام کے بعد کیا۔(۲۴) ماسوا چند تاریخوں کے داغؔ کی کم وبیش تمام تاریخیں حیدر آباد کے قیام کے دوران کہی گئیں۔ اس بنا پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ داغؔ کو نواب نظام کے دربار میں رسائی، قدر و منزلت اور مقام حاصل کرنے کے لیے

صرف شاعری ہی نہیں تاریخ گوئی کا سہارا بھی لینا پڑا ہوگا۔ چونکہ انھیں تاریخ گوئی کے فن سے فطری مناسبت نہیں تھی اس لیے انھوں نے نت نئی، نادر اور محیر العقول تاریخیں کہنے کی بجائے سیدھی سادھی تاریخیں ہی کہیں اور ان تاریخوں میں زبان کی چاشنی اور برجستگی کو ملحوظ خاطر رکھا۔ یہ داغ کی شاعری کا خاصہ بھی ہے اور تاریخ کا بھی۔ داغ نے اپنی تاریخوں میں صفائی زبان، روزمرہ اور برجستگی کو برت کر تاریخ گوئی کی روایت میں ایک اہم اضافہ کیا۔ یہی خصوصیت انھیں اپنے معاصر شعرا میں ممتاز بناتی ہے۔

جس طرح داغ نے اردو غزل کو ایک نئے رنگ سے آشنا کیا۔ اسی طرح تاریخ گوئی کے فن کو بھی نیا رنگ دیا۔ اس عہد میں تاریخ گوئی تکلف اور تصنع کے بوجھ سے دب رہی تھی۔ داغ نے تاریخ گوئی کے فن کو اس تکلف، تصنع اور مصنوعی پن سے آزاد کیا اور تاریخوں کو سادگی، برجستگی اور لطف زبان سے آراستہ کر کے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔ داغ، شاعری کی طرح تاریخ میں بھی زبان وبیان کی صفائی اور ندرت کو اہمیت دیتے تھے اور خوبی زبان کو شعر کی طرح تاریخ کا بھی حصہ جانتے تھے اسی وجہ سے وہ تاریخوں میں شعر کی طرح تعقید کے عیب کو پسند نہیں کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کی تاریخوں پر اصلاح دیتے ہوئے محاورۂ زبان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے عزیز شاگرد نواب عزیز جنگ ولا لکھتے ہیں:

> ''سبحان اللہ زبان کے متعلق آپ کی اصلاح کا کیا کہنا۔ آپ نے ہمارے بعض ان مادہ ہائے تاریخ کو کاٹ کر پھینک دیا جن کی ترکیب میں مبتدا سے خبر دور جا پڑی ہوئی تھی اور ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ حسنِ کلام سے یہ ہے کہ مبتدا سے خبر قریب ہو۔ ہمارے بعض تاریخی مادوں کی ترکیب آپ نے پلٹ دی اور ان کی رونق دوبالا فرمادی اور تعقیدِ الفاظ کے آپ ہمیشہ مخالف تھے۔ آپ کی تاکید تھی کہ بامحاورہ الفاظ کا لحاظ رکھا جائے اس لیے کہ خوبیِ زبان کا درجہ سب پر مقدم ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ عمدہ مضامین نقصانِ زبان کی وجہ سے خاک میں مل جاتے ہیں اور کم درجہ کا مضمون بھی خوبیِ زبان کے ساتھ چمک اٹھتا ہے۔'' (۴۵)

ذیل میں دیوانِ احسان، کلیات مذاق کی اشاعت، طلائی توڑا عنایت ہونے اور تنخواہ میں اضافے کی تاریخیں درج کی جاتی ہیں جن سے داغؔ کی صفائی زبان پر روشنی پڑتی ہے۔

کانِ معنی، جانِ مضموں، حسنِ عشق و عشقِ حسن　　ہے عجب دیوان کیا کہنا ہے اس دیوان کا
خوب لکھی داغ نے تاریخ سن کر یہ کلام　　گوشِ اہلِ عشق پر احسان ہے احسان کا ۱۳۱۰ھ (۲۶)

عطیاتِ پیہم کا کیا شکر ہو　　کہ فدوی کو کیا کیا عنایت ہوا
بدیہہ کہو داغ تاریخ تم　　یہ سونے کا توڑا عنایت ہوا ۱۳۱۲ھ (۲۷)

طبع نورانی اس کو کہتے ہیں　　کیا ہی روشن ہوا ہے نام مذاق
لکھ دے اے داغ مصرعِ تاریخ　　سحر و اعجاز ہے کلامِ مذاق ۱۳۰۳ھ (۲۸)

ہوگیا میرا اضافہ آج دونے سے سوا　　یہ کرم اللہ کا ہے یہ عنایت شاہ کی
اس ترقی کی کہو اے داغ یہ تاریخ تم　　ابتدا سے اپنی ساڑے پان سو نقدی پڑی ۱۳۱۰ھ (۲۹)

مندرجہ بالا تاریخوں میں داغؔ نے صفائی زبان، بدیہہ گوئی اور برجستگی کا خیال رکھا ہے۔ مادہء تاریخ کی زبان رواں، صاف اور بول چال کی زبان کے قریب ہے۔ ان تاریخوں میں وہ اردو پن بھی موجود ہے جو داغؔ کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ مذکورہ بالا تاریخوں میں کہیں بھی آورد اور مصنوعیت کا خیال نہیں گزرتا۔ اس عمل سے مندرجہ بالا تاریخوں میں سہل ممتنع کی سی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ تاریخ گوئی کی روایت میں یہ انداز بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

تاریخ گوئی ایک ایسا فن تھا جس میں مہارت حاصل کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہوتی تھی۔ انیسویں صدی میں کسی شخص کا شاعر ہونا اور تاریخ گو ہونا لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا۔ (۳۰) کوئی شخص شاعر ہو اور وہ تاریخ نہ کہہ سکتا ہو اس کی شاعرانہ صلاحیت مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ حالیؔ نے اسی بات سے چڑ کر کہا تھا کہ ’ہمارے ملک کے (شعرا) اور تو کسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے اور در حقیقت ہیں بھی نہیں البتہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی ان سے اس وقت متعلق ہو جاتی ہے جب کوئی مہتم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے۔۔۔ جو شخص مادہء تاریخ فی الواقع یا صاحب فرمائش کے نزدیک سب سے اچھا نکال

لاتا، اس کا فی الجملہ اعتبار بڑھ جاتا'(۳۱) وہ لوگ جو شاعر تو ہوتے تھے لیکن تاریخ گوئی میں مشاق نہیں تھے، ان کی کہی ہوئی تاریخوں میں وہ خوبصورتی نہیں ہوتی تھی جو مشاق اور ماہر تاریخ گو شاعروں کی تاریخوں میں ہوتی تھی۔ ایسے شاعر کبھی آدھے مصرع سے اور کبھی تعمیہ یا تخرجہ کے استعمال سے تاریخ کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کی اکثر تاریخیں موضوع سے مطابقت بھی نہیں رکھتی تھیں۔ایسی تاریخوں کو زبردستی کی تاریخ کہا جاتا ہے اور اس طرح کی تاریخوں کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ماہر، مشاق اور ہنر مند تاریخ گو نہ صرف پورے مصرع سے تاریخ نکالتا تھا بلکہ وہ وقوع واقعہ سے متعلق بھی ہوتی تھیں اور بعض اوقات تو صنعتوں کے استعمال سے مادہ ءتاریخ میں مزید خوبصورتی پیدا کر دیا کرتے تھے۔داغ کا شمار بھی ان ماہر تاریخ گو شعرا میں ہوتا تھا جو پورے مصرع سے تاریخ حاصل کرتے تھے۔ماسوا چند تاریخوں کے داغ کی بیشتر تاریخیں پورے مصرع سے حاصل کی گئی ہیں۔ یہ خوبی بھی داغ کے مشاق تاریخ گو ہونے کی نشانی ہے۔انھوں نے اپنی تاریخوں میں پورے مصرع سے ہی تاریخ بر آمد نہیں کی بلکہ مادہ ءتاریخ میں خوبیِ زبان کا خیال بھی رکھا اور روانی اور برجستگی بھی پیدا کی۔تاریخ کہنے کی یہ صلاحیت بھی بہت کم شعرا کے حصے میں آئی۔

ذیل میں نظام دکن کی سالگرہ، شاہزادہ ءنظام دکن کی تسمیہ خوانی اور ختنے کی تاریخیں درج کی جاتی ہیں جن سے داغ کی تاریخ گوئی کی مشاقی اور مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔

بالیدگی نشاط کو ایسی ہے آج کل — بارش میں جس طرح کہ زراعت کو ہونمو
دن رات ہے یہ داغ نمک خوار کی دعا — خوش حال خیر خواہ ہوں بد حال ہوں عدو
کیا شاندار مصرع تاریخ ہے یہ داغ — پینتیسویں ہے سال گرہ جل شانہ ۱۳۱۸ھ(۳۲)

تسمیہ خوانی ہوئی ہے شاہزادے کی جو آج — بادشاہ کے ساتھ یا اللہ مبارک سب کو
داغ نے یہ مصرع تاریخ برجستہ کہا — چھوٹے شہزادے کی بسم اللہ مبارک سب کو ۱۳۱۱ھ(۳۳)

یہ شادی مبارک ہو مسعود ہو — ادا ہوگئی سنت مصطفا
یہ برجستہ لکھ داغ مصراع حال — ولی عہد صاحب کا ختنہ ہوا ۱۳۱۱ھ(۳۴)

تاریخ کے محاسن میں سے ایک یہ ہے کہ تاریخ میں وقوع واقعہ کا بلا کم وکاست اظہار ہو۔ تاریخ پڑھ کر معلوم ہوجائے کہ شاعر نے کیوں اور کس موقع پر تاریخ کہی ہے۔ تاریخ کی خوبی اس وقت دوبالا ہوجاتی ہے جب مادہ تاریخ ہی میں شاعر ایسا لفظ یا الفاظ لائے جس سے واقعہ کی طرف صاف اشارہ موجود ہو اور تاریخ پڑھنے والے کو صرف مادہ ء تاریخ سے ہی وقوعِ واقعہ کا پتہ چل جائے۔ یہی خوبی کسی تاریخ کو کو بڑا تاریخ گو بناتی ہے۔ ایہام کو تاریخ میں مستحسن خیال نہیں کیا جاتا۔ وہ تاریخ اچھی شمار کی جاتی ہے جو واضح ہو اور وقوعِ واقعہ سے متعلق ہو۔ داغ کی تاریخوں میں بالعموم وقوعِ واقعہ کا اظہار بھی ہوتا ہے اور مادہ تاریخ میں صاحب واقعہ کا نام بھی موجود ہوتا ہے۔ نواب عزیز جنگ ولا نے داغ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''اگر کسی مادہ میں زبان کی خوبی ہو اور صاحب واقعہ کا نام نہ آسکے تو ایسا مادہ اس مادہ پر فائق ہوگا جس میں صاحب واقعہ کا نام تو ہو مگر زبان کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو''۔(۳۵) اس قول سے دو باتیں مترشح ہوتی ہیں اول یہ کہ داغ مادۂ تاریخ میں زبان کی خوبی کو اولیت دیتے تھے لیکن تاریخ میں صاحبِ واقعہ کا نام اور وقوع واقعہ کے اظہار کو بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ داغ کی بیشتر تاریخیں اسی بات کو مدِ نظر رکھ کر کہی گئی ہیں۔ چند تاریخیں دیکھیے۔

بال باندھا ہے نشانہ شاہ کا　　ایسی بندوق سے کیا بچ کر جائے
داغ نے سن کے کہی تاریخ　　ایک زخمی سا گیا دو شیر آئے ۱۳۱۱ھ(۳۶)

تھے آفریں حافظِ خوش بیاں　　کیا اپنے اوستاد کا حق ادا
یہ تاریخ اس کی کہی داغ نے　　خوشا پاک دیوان صابر چھپا ۱۳۰۴ھ(۳۷)

زندگی کے مرے احسن نے سوانح لکھے　　عمر کے باغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھو
داغ نے مصرع تاریخ کہا برجستہ　　جلوۂ داغ یہ آنکھ سے جلوہ دیکھو ۱۳۱۰ھ(۳۸)

ہوئی شہرت کلامِ خوش بیاں کی　　سنی ہم نے نوید جاں فزا اب
لکھا ہے داغ نے یہ مصرع سال　　ظہیر الدین کا دیوان چھپا اب ۱۳۱۶ھ(۳۹)

محمد دین فوق نے 'پنجۂ فولاد' نامی اخبار جاری کیا تو اس کی تاریخ 'پنجۂ فولاد نامی پائیدار اخبار ہے' (۴۰) سے نکالی۔ گھڑی کا تحفہ ملا تو اس کی تاریخ 'مرصع منور گھڑی شاہ نے دی' (۴۱) سے حاصل

کی۔سونے کا توڑا عنایت ہوا تو تاریخ کہی 'یہ سونے کا توڑا عنایت ہوا' (۴۲) اسی طرح مولوی راسخ کے دیوان کی تاریخ 'کلامِ مولوی راسخ ہے نادر' سے برآمد کی۔ (۴۳)

انیسویں صدی میں تاریخ گوئی کی روایت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔نت نئے اور محیر العقول انداز میں تاریخیں کہنا معمول بن گیا تھا۔کوئی ایسی صنعت اور طریقہ باقی نہیں رہا تھا جس میں تاریخیں نہ کہی گئی ہوں۔داغ کی شاعری کی طرح تاریخوں میں بھی صنعتوں کا شعوری التزام نہیں ملتا۔ اردو تاریخوں میں صنعت ترصیع میں کہی ہوئی ایک تاریخ ملتی ہے جسے انھوں نے نواب کلب علی خان والیِ رام پور کے جشن مسند نشینی کے موقع پر پیش کیا تھا اس قطعہ کے گیارہ اشعار ہیں اور تمام مصرعے تاریخی ہیں جن سے ۱۲۸۲ھ ہی برآمد ہوتے ہیں۔

بھر کر شراب صاف پلا آج جام میں ۱۲۸۲ھ ساقی ہے انجمن کی زباں پر ترانہ آج ۱۲۸۲ھ
رنگیں بدل زمانہ تعجب نہیں گر اب ۱۲۸۲ھ شادی کا زہرہ رنگ سے دے شادیانہ آج ۱۲۸۲ھ
پریوں کا جمگھٹ اور حسینوں کا جلسہ ہے ۱۲۸۲ھ کیا ایک رنگ پر ہے یہ جشن شہانہ آج ۱۲۸۲ھ
فانوس جھاڑ آئینے تصویر لیمپ بھی ۱۲۸۲ھ چمکا ہے بزم جشن سے دیوان خانہ آج ۱۲۸۲ھ
سارا ہے جلوہ کلب علی خاں کے دم سے آج ۱۲۸۲ھ عہد سرور آج ہے جشنِ شہانہ آج ۱۲۸۲ھ
آفاق کیا سخا و کرم سے کیا بحال ۱۲۸۲ھ حاتم کا کیا مٹایا جہاں سے فسانہ آج ۱۲۸۲ھ
یہ سروری ہے داد و دہش اس قدر کہ بس ۱۲۸۲ھ کیا کیا دیا ہے دولت و مال وخزانہ آج ۱۲۸۲ھ
پیدا کہاں ہے لعل خوش آب آج کوہ میں ۱۲۸۲ھ یکتا رہا صدف میں نہ گوہر کا دانہ آج ۱۲۸۲ھ
پیہم ہے سجدہ زیر نہاں فرق فرقداں ۱۲۸۲ھ کیا کیا ہوا بلند ترا آستانہ آج ۱۲۸۲ھ
کچھ سہم کی نہیب سے تھرائے شکل بید ۱۲۸۲ھ کھچے جو مدعی پہ ترا تازیانہ آج ۱۲۸۲ھ
موج عطا سے پاس ہوا خواہ شادمان ۱۲۸۲ھ حاسد کا دم ہے تن سے ہو بیشک روانہ آج ۱۲۸۲ھ (۴۴)

اس تاریخ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مرزا داغ نے قطعے کے دو عنوان رکھے۔ پہلا 'تعریف جشن زیبا جاہ دام ملکہ' اور دوسرا 'تہنیت جشن نایاب' دونوں تاریخی عنوان ہیں اور ان سے ۱۲۸۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔داغ نے ایک تاریخ نثر میں بھی کہی ہے۔نواب دلاور النساء بیگم کا انتقال ہوا تو اور تاریخوں

کے ساتھ ایک تاریخ نثری جملے سے بھی نکالی۔تاریخ یہ ہے۔'نواب دلاورالنساءبیگم پاک دامن نے انتقال کیا'۱۳۰۵ھ(۴۵)

تعمیہ یا تخرجہ تاریخ کے نقائص میں سے ایک نقص ہے۔داغ کی تاریخوں میں دو چار تاریخوں میں تعمیہ یا تخرجہ کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ نقص بھی اچھا مادۂ تاریخ ہاتھ آنے یا کسی مصروفیت کی بناپر تاریخ میں در آیا ہے۔ذیل میں دو تاریخیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان تاریخوں سے ہی مترشح ہوتا ہے کہ مادۂ تاریخ خوبصورت ہاتھ آ گیا اور اس میں زبان کی وہ لطافت بھی موجود ہے جس پر داغ جان دیتے تھے۔ اسی وجہ سے اس نقص کو برقرار رکھا۔تاریخ یہ ہے:

کر گئے رحلت امیر احمد امیر اب نشاطِ زندگی جاتا رہا
مل گئی تاریخ دل سے داغ کے آہ لطف شاعری جاتا رہا ۱۳۱۸ھ(۴۶)

مندرجہ بالا تاریخ میں بھی داغ نے ،داغ کے دل، الف کے ایک عدد کو مادۂ تاریخ 'آہ لطف شاعری جاتا رہا' کے اعداد ۱۳۱۷ میں شامل کر کے تعمیہ کیا ہے۔محمد حسن خان کی وفات کی تاریخ میں بھی تین عدد کا تعمیہ کیا ہے۔تاریخ یہ ہے:

سرِ لفظِ جنت سے تاریخ سن لو محمد حسن خان نے فردوس دیکھا (۴۷)

اس تاریخ میں جنت کے سرج کے ۳ عدد کو مادۂ تاریخ 'محمد حسن خان نے فردوس دیکھا' کے ۱۳۱۱ اعداد میں شامل کر کے تعمیہ کیا ہے۔داغ نے صوری ومعنوی تاریخیں نہیں کہیں 'مہتاب داغ' میں صرف ایک ایسی تاریخ موجود ہے جس میں صوری ومعنوی تاریخ کہی ہے۔ یہ تاریخ نواب دلاورالنساء بیگم کی وفات کی تاریخ ہے۔

قصرِ جنت میں ہوئیں زینت بخش بیگم رابعہ اوصاف و خصال
بہتر تاریخ یہ کہہ دے اے داغ پنجشنبہ مہ ذی الحجہ سال ۱۳۰۵ھ(۴۸)

مندرجہ بالا تاریخ میں مادۂ تاریخ 'پنجشنبہ مہ ذی الحجہ سال ہے' جس سے (۴۱۲-۴۵+۷۵۷+۹۱)۱۳۰۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔اور مادۂ تاریخ میں مہینہ اور تاریخ کا ذکر بھی موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی وحوالہ جات

(۱) آثارالشعرا،مولوی ممتازعلی، مطبع شاہ جہانی، بھوپال،۱۳۰۶ھ،ص ۱۶۵

(۲) تاریخ کی دواقسام ہیں (بعض اساتذہ نے تین بھی لکھی ہیں) (i) صوری/لفظی (ii) معنوی۔صوری تاریخ وہ ہے،جس میں محض الفاظ سے تاریخ نکلتی ہومثلاً

گیارہ سو اکیاسی ہجری کی تھی　　　　یہی سال تاریخ رحلت کی تھی

مذکورہ شعر میں واضح انداز میں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ گیارہ سو اکیاسی ہجری ہے۔اور معنوی وہ تاریخ ہے،جس میں کسی حرف،حروف لفظ یا لفظوں کے مجموعے سے بحساب جمل تاریخ برآمد ہو۔مثلاً

کس محل کو منہدم تو نے کیا　　　　کیوں نہ غم سے ہو جگر چاک اے فلک

لاکھ حسرت سے کہوں میں بہر سال　　　　کاخ ہو جائے آج وہ خاک اے فلک

مذکورہ تاریخ میں مادہ، تاریخ 'کاخ ہو جائے آج وہ خاک' ہے جس کے حروف سے بحساب جمل (۶۲۱ + ۱۱ + ۴ + ۱۴ + ۱۱ + ۶۲۱) ۱۲۸۲ھ سال مطلوب برآمد ہوتا ہے۔ فارسی اور اردو تاریخ گوئی کی روایت میں ابتدائی تاریخوں کی مثالیں لفظی ہی ملتی ہیں ۔ کیونکہ ابتدا میں سادہ،لفظی اور عام تاریخیں ہی کہی گئیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس فن کے کہنے والوں نے اس میں اس درجہ کمال حاصل کیا کہ تاریخیں ان کے ہاتھوں میں ایک کھیل بن گئی تھیں ۔معنوی اور اچھی تاریخ کہنے کے لیے اس بڑے ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ گجرات میں ملنے والے تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں تاریخ کہنے کا رواج کافی عرصہ پہلے ہو چکا تھا۔

(۳) دیکھیے: تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب،لاہور ۱۹۷۵،ص ۱۰۵

(۴) تفصیل کے لیے دیکھیے: بیجاپور میں اردو تاریخ گوئی کی روایت، ابرار عبدالسلام، جرنل آف ریسرچ، فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ اسلامک سٹڈیز بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، والیوم (۱۱) ۲۰۰۷

(۵) دیکھیے: (i) مفتاح التواریخ، طامس ولیم بیل، منشی نول کشور کانپور ۱۸۶۷ء ص ۱۴۵ (ii) تاریخ ارتقاء زبان و ادب، انصاراللہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ص ۳۲۱ (iii) تاریخ اقلیم ادب جلد اول، انصاراللہ، علی گڑھ،۱۹۷۹ء ص ۶۴ (iv) تاریخ ادب اردو، مرتبہ عبدالقیوم، پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز، کراچی ۱۹۶۱ء ص ۱۷۱

(۶) توقیت داغ، کالی داس گپتا رضا، مشمولہ شاعر جلد ۶۵ شمارہ نمبر ۱، ص ۸

(۷) ایضاً (۸) ایضاً

(۹) داغؔ کی شاعری مشمولہ ادب اور ادیب، ڈاکٹر اعجاز حسین، ادارہ انیس اردو، الہ آباد، بار اول ۱۹۶۰ء ص ۵۹

(۱۰) داغ، تمکین کاظمی، ص ۲۱

(۱۱) مہتاب داغ مشمولہ کلیات داغ، داغ دہلوی، مرتبہ نواز چودھری، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، س۔ن۔ ص ۶۹۶

(۱۲) توقیت داغ ص ۹ (۱۳) داغ، تمکین کاظمی ص ۱۴۰ (۱۴) مہتاب داغ ص ۹۲۷

(۱۵) توقیت داغ ص ۹ (۱۶) داغ، تمکین کاظمی ص ۱۴۰

(۱۷) داغ اور تاریخ گوئی، کالی داس گپتا رضا، مشمولہ سہ ماہی اسباق پونہ، اپریل جون ۱۹۹۷ء ص ۱۳۶

(۸) داغ کے تین دواوین میں شائع شدہ تاریخوں کی تعداد ۱۰۹ ہے۔ ان کے علاوہ ایک تاریخ منشی ظہیر احسن شوق نیموی کی مثنوی 'سوز و گداز' ایک نوح ناروی کے دیوان 'سفینۂ نوح'، ایک بنیاد حسین جاہ کے دیون 'دیوان جاہ'، ایک ایک شیخ الٰہی بخش شائق اور میر مہدی حسین الم کی لغات 'آئینہ تواریخ' اور 'گلبن تاریخ'، ایک میر مہدی حسین مجروح کے دیوان 'مظہر معنی' ایک میر جعفر علی رنج موسوی کے دیوان 'مخبر عشق'، ایک دیوان ذوق مطبوعہ مطبع احمدی، ایک راجہ محمد امیر حسن کی کلیات 'کلیات سحر'، ایک محمد داؤد احمد ہادی کی مثنوی 'پری پیکر'، ایک احمد حسین مذاق کی کلیات 'کلیات مذاق'، ایک شاہ نصیر کے دیوان چمنستان سخن، ایک ناسخ کے دیوان 'ارمغانی'، ایک عاشق حسین بزم کی مثنوی 'تصویر سخن'، اور ایک امیر مینائی کے مجموعہ واسوخت 'واسوخت اردو' میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک تاریخ جارج پیش شور کی وفات کی بھی دستیاب ہوتی ہے۔ یہ وہ تاریخیں ہیں جو داغ کے دواوین میں شائع نہیں ہوئیں۔ ان سولہ تاریخوں کو اگر ان کے دواوین میں شائع شدہ تاریخوں میں شامل کر دیں تو ان کی تعداد سوا سو بن جاتی ہے۔ اگر مزید کوشش کی جائے تو مزید تاریخیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ جب کہ کالی داس گپتا رضا کا خیال ہے کہ ان کی تمام تاریخیں سوا سو تک پہنچ جائیں گی۔ ان تاریخوں کی تفصیل ذرا سی کوشش سے حاصل کی گئی ہے۔ داغ کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے بہت سے شاگردوں کے دواوین شائع ہوئے ہوں گے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں سے بہت سے شاگردوں کے دواوین کی تاریخیں داغ نے نہ کہی ہوں۔ اسی طرح بہت سے ملنے والے دوستوں، عزیز و اقارب کی وفات، واقعات اور ان کے بچوں کی پیدائش کی تاریخیں بھی کہی ہوں گی۔ ان دلائل کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ داغ نے کم و بیش دو سو تاریخیں ضرور کہی ہوں گی اور کالی داس گپتا رضا کا بیان حقیقت پر مبنی نہیں۔

(۱۹) داغؔ، تمکین کاظمی ص ۱۲۰ (۲۰) مطالعۂ داغؔ ص ۲۵۴ (۲۱) مہتاب داغ ص ۹۲۷

(۲۲) دیکھیے: غرائب الجمل، نواب عزیز جنگ ولا، مرتبہ ڈاکٹر حسن الدین احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۱۹۹۸، ص ۱۳۲

(۲۳) ایضاً، داغؔ کے حوالے سے نواب عزیز جنگ ولا کا بیان درج ذیل حوالے کے متن میں ملاحظہ کیجیے۔ امیر مینائی کے کئی خطوط میں ان کی تاریخوں پر اصلاح دینے کا ثبوت ملتا ہے۔ مولوی محمد اعجاز حسن کے نام خط میں لکھتے ہیں۔ 'اس سے پہلے جو تاریخ تم نے بھیجی تھی۔ وہ بھی دیکھ کر بھیج چکا ہوں۔ اس کی رسید اب تک نہیں آئی' (ص ۲۷۸) انھی کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں 'عزیزی محمد ابوالحسن خاں کی تاریخ دیکھ کر بھیجتا ہوں۔ پورا قطعہ اچھا ہے۔ میرا جی بہت خوش ہوا۔ طبیعت ہونہار معلوم ہوتی ہے' (ص ۲۸۳) مولوی مظہر الاسلام کے نام خط میں لکھتے ہیں 'تاریخ جو آپ نے کہی ہے اس میں لفظ بلند۔ کان محض بہ ضرورت تاریخ ہے۔ دیوان کی تاریخ میں شاعر کی صفت بلند خیال چاہیے نہ بلند۔ کان اور ہاں بہمہ تکلف بھی باعتبار اعداد تاریخ پورے نہیں کہ سر امثال سے ایک عدد کا تعمیہ کیا گیا۔ تقریظ ہو یا تاریخ غرض تو اس سے بھی یہی ہوتی ہے کہ اہل سخن پسند کریں اور اگر بھرتی ہوئی تو اس ہونے سے نہ ہونا اچھا'۔ (مکاتیب امیر مینائی مرتبہ مولوی احسن اللہ خاں ثاقب، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۴، ص ۳۱۱)

(۲۴) ڈاکٹر سید محمد علی زیدی کا خیال ہے کہ داغؔ نے تاریخ گوئی کا آغاز قیام حیدرآباد دکن کے بعد کیا۔ ان کا بیان ہے۔ 'داغؔ کو فن تاریخ گوئی میں خاص کمال حاصل تھا۔ ان کے قطعات تاریخ کی تعداد ۱۰۹ ہے۔ جو ۴۷۹، اشعار پر مشتمل ہیں۔ یہ تمام قطعات مطبوعہ ہیں۔ گلزار داغ میں ۲، مہتاب داغ میں ۷۳ اور یادگار داغ میں ۳۴۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے تقریباً تمام قطعات تاریخی قیام حیدرآباد کے دوران کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظام حیدرآباد میر محبوب علی خان کے استاد اور درباری شاعر ہونے کی وجہ سے ہر اس واقعے یا موقعے کا جس کا تعلق نظام سے ہوتا ریخی مادہ نکالنا ان کے فرائض منصبی میں شامل تھا' (مطالعۂ داغؔ، ڈاکٹر سید محمد علی زیدی، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۴، ص ۱۵۴) ڈاکٹر صاحب کے بیان میں کسی حد تک کلام کیا جا سکتا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کا خیال یہ ہے کہ دو چار تاریخوں کے سوا تمام تاریخیں حیدرآباد دکن میں کہی گئیں اور نواب نظام کے لیے کہی گئیں تو درست نہیں کیونکہ 'گلزار داغ' کی دو تاریخیں اور 'مہتاب داغ' کی کچھ تاریخیں قیام رام پور کے دوران کہی گئیں۔ قیام حیدرآباد کے دوران بھی انھوں نے اپنے دوست احباب کے لیے تاریخیں

کہیں ۔مزید یہ کہ داغؔ کے مطبوعہ قطعات تاریخی کی تعداد ۱۰۹ نہیں بلکہ زیادہ ہے جس کی تفصیل متن میں موجود ہے۔البتہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ داغؔ کی بیشتر تاریخیں قیام حیدرآباد کے بعد کہی گئیں ۔اور بیشتر تاریخیں نواب نظام حیدرآباد کے لیے کہی گئیں ۔

(۲۵) غرائب الجمل ص۱۳۴

(۲۶) دیوان احسان،محمد احسان علی خان احسان شاہ جہاں پوری،م ۔ن،۱۳۱۰ھ ص۲۹۶ ۔ مذکورہ تاریخ سے ۱۳۱۰ھ ہی برآمد ہوتے ہیں ۔لیکن 'گلزار داغ' مرتبہ احسن مارہروی ص۲۳۱ میں مادہ ءتاریخ 'گوش اہل عشق پر احسان ہے یہ احسان کا' درج ہے ۔مادہ ءتاریخ میں 'یہ' کے لفظ کے اضافے سے سال مطلوب ۱۳۱۰ھ کی بجائے ۱۳۲۵ھ حاصل ہوتا ہے جو کہ درست نہیں ۔یہی غلطی ڈاکٹر سید محمد علی زیدی نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے 'مطالعہ ءداغؔ' (ص۲۵۶) میں دہرادی ہے اوراسی غلطی کا اعادہ 'کلیات داغ' مرتبہ نواز چودھری میں بھی ہوا ہے۔ (ص۱۲۸۴)

(۲۷) یادگار داغ،داغؔ دہلوی،مرتبہ احسن مارہروی،اسلامیہ سٹیم پریس لاہور،ص۲۲۹

(۲۸) کلیات مذاق،احمد حسین مذاق،قومی پریس،لکھنؤ،۱۸۸۶ءص۹۳

(۲۹) ایضاً ص۲۳۰ ۔مذکورہ تاریخ سے ۴۰۸ +۴۰۷+۶۳+۱ +۲۷ +۱۱۹+۱۶۴+۲۱۴=۱۳۰۷عدد حاصل ہوتے ہیں ۔'گلزار داغ' مرتبہ احسن مارہروی میں یہی تاریخ درج ہے جب کہ سنہ۱۳۱۲ھ درج ہے۔دراصل کاتب سے غلطی ہوئی ۔اس نے بڑھی کو پڑی بنادیا ۔جس سے کی وجہ سے حرف 'ھ' کے نکل جانے کی وجہ سے ۵عدد کی کمی واقع ہو گئی۔یہی غلطی کلیات داغ مرتبہ نواز چودھری میں دہرائی گئی ہے۔ (ص۱۲۸۲)لالہ سری رام نے 'خم خانہ ءجاوید' میں مادہ ءتاریخ 'ابتدا سے اپنی ساڑھے پانسو نقدی بڑھی' لکھا ہے۔سری رام یا کاتب نے ساڑے کو ساڑھے بنادیا جس کی وجہ سے ۵سال کا فرق پڑ گیا ۔دیکھیے : (خم خانہ ءجاوید جلد دوم،لالہ سری رام،دلی پرنٹنگ ورکس،دہلی،۱۹۱۷ءص۲۳۱)یہی غلطی ڈاکٹر سید محمد علی زیدی نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے مطالعہ ءداغؔ'ص۲۵۶ میں کردی ہے۔

(۳۰) اس حوالے سے نظم طباطبائی،مالک الدولہ صولتکے حوالے سے لکھتے ہیں ۔''مرحوم کو تاریخ کی بڑی مشق تھی ۔ناسخ کے تتبع میں ان کے تمام شاگردوں نے تاریخ کو صنائع شعریہ میں شمار کیا تھا ۔شاعر کا تاریخ گو ہونا لازم سمجھتے تھے۔۱۸۷۲ءمیں مٹیا برج سے میں لکھنؤ آیا تو یہاں دیکھا کہ اکثر شاعروں نے اس کا التزام کرلیا ہے

کہ ہر غزل کے مقطع میں تاریخ ضرور ہو۔ انھیں دنوں میں ایک طرح ہوئی تھی 'جواب اچھی طرح، حساب اچھی طرح' میں اس مشاعرہ میں شریک تھا۔ اپنے ایک مہربان حکیم مرزا فدا احمد صاحب دانش کا تاریخی مصرعہ جو حروف معجمہ میں ہے مجھے اب تک یاد ہے۔ 'مجتمع سب لوگ صحبت انتخاب اچھی طرح' دیکھیے: (خاتمہ مالک لدولہ صولت، نظم طباطبائی، مشمولہ ادیب الہ آباد، پہلی جلد، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۸۸ء ص ۴۷۔۴۶)

(۳۱) دیوان حالی، الطاف حسین حالی، نامی پریس کانپور، ۱۸۹۳ء ص ۳۲۰

(۳۲) یادگار داغ ص ۲۳۸

(۳۳) ایضاً۔ مذکورہ تاریخ سے ۴۲۴ + ۳۲۷ + ۳۰ + ۱۰۲ + ۶۶ + ۲۶۳ + ۸۸ = ۱۳۰۰ عدد حاصل ہوتے ہیں جب کہ مطلوب ۱۳۱۱ ہیں۔ ۱۱ کی کمی لفظ 'ہو' سے پوری ہوتی ہے۔ 'گلزار داغ' مرتبہ احسن مارہروی میں کاتب کی غلطی کی وجہ سے دونوں مصرعوں میں 'ہو' کا لفظ کتابت ہونے سے رہ گیا ہے جس سے مادہ ٔ تاریخ غلط ہو گیا۔

(۳۴) ص ۲۳۱۔ مذکورہ تاریخ سے ۴۶ + ۹۷ + ۱۰۱ + ۲۱ + ۱۰۵۵ + ۱۲ = ۱۳۱۴ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ جب کہ حاصل سنہ ۱۳۱۰ بنتا ہے۔ یا تو داغؔ کی یہ تاریخ ۱۳۱۰ھ میں ہی کہی گئی ہوگی جو کتابت کی غلطی سے ۱۳۱۱ھ لکھی گئی ہو گی کیونکہ اس تاریخ کے بعد کی تاریخ بھی ۱۳۱۰ھ کی ہی ہے یا داغؔ نے ایک عدد کی کمی کو مصرع کی خوبصورتی کے تناظر میں جائز رکھا ہوگا۔

(۳۵) غرائب الجمل ص ۱۳۲ (۳۶) یادگار داغ ص ۲۳۱

(۳۷) ریاض صابر، مرزا قادر بخش صابر، مطبع اخبار آصفی حیدر آباد دکن ۱۳۰۵ھ ص ۸۔ مذکورہ تاریخ سے ۹۰۷ + ۲۳ + ۷۱ + ۲۹۳ + ۱۱ = ۱۳۰۵، عدد حاصل ہوتے ہیں جب کہ تاریخ کے نیچے ۱۳۰۴ھ درج ہے۔ 'مہتاب داغؔ' میں بھی ۱۳۰۴ھ ہی درج ہے۔ 'ریاض صابر' کی تکمیل کی تاریخ ۱۳۰۴ھ ہے۔ یہ تاریخی نام بھی ہے اور اس سے ۱۳۰۴ھ ہی برآمد ہوتے ہیں۔ جس سے اس دیوان کی تکمیل کی تصدیق ہوتی ہے لیکن مادہ ٔ تاریخ سے ۱۳۰۵ھ کیوں حاصل ہوتے ہیں اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ یہ کاتب کی غلطی سے ہوا۔ داغؔ نے مادہ ٔ تاریخ 'خوش پاک دیوان صابر چھپا' لکھ کر بھیجا ہوگا اور کاتب نے اسے خوشا بنا دیا ہوگا اور دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس مادہ ٔ تاریخ میں دانستاً تبدیلی کی گئی ہوگی چونکہ تکمیل سے اشاعت تک میں ایک سال کا عرصہ لگ گیا اور داغؔ نے تکمیل کے فوراً بعد تاریخ کہہ کر بھیج دی ہوگی اور اشاعت کے وقت مادہ ٔ تاریخ میں الف کا اضافہ کر کے ایک سال کی گنجائش نکالی گئی ہوگی۔ جب کہ سنہ ٔ تاریخ کو کاتب تبدیل کرنا بھول گیا ہو

گا اور وہی پرانا سنہ درج کر دیا ہوگا۔ 'مہتاب داغ' کی اشاعت کے وقت بھی اسی طرح کی غلطی ہوئی ہوگی۔

(۳۸) یادگار داغ ص ۲۳۰۔ مذکورہ تاریخ سے ۴۴+۱۰۰۵+۱۵+۷۶+۷۰+۴۴+۴۵=۱۲۹۹ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ مذکورہ مادہ تاریخ میں 'کا' کا لفظ کاتب کی غلطی کی وجہ سے چھٹا ہوا لگتا ہے کیونکہ پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں بھی لفظ 'کا' موجود ہے۔ اگر مادہ تاریخ میں 'کا' کے اعداد کا اضافہ کیا جائے تو ۲۱ اعداد کا اضافہ ہو جاتا ہے جس سے حاصل سنہ ۱۳۲۰ھ بنتا ہے جب کہ سال مطلوب ۱۳۱۰ھ ہے۔ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے 'مطالعہ داغ' میں مادہ تاریخ 'جلوہ داغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھا' لکھا ہے اور سنہ ۱۳۲۰ تحریر کیا ہے۔ جس سے مطلوبہ سال برآمد نہیں ہوتا۔ انھوں نے مادہ تاریخ میں لفظ 'دیکھو' کو دیکھا کر دیا۔ ص ۲۵۵ لیکن سنہ مطلوب ۱۳۲۰ھ تحریر کیا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سال مطلوب ۱۳۲۰ھ ہی ہوگا۔

(۳۹) ایضاً ص ۲۳۴

(۴۰) انشائے داغ، مرتبہ سید علی احسن مارہروی، انجمن ترقی اردو، ہند دہلی، ۱۹۴۱ء ص ۱۲۱

(۴۱) یادگار داغ ص ۲۲۹

(۴۲) ایضاً

(۴۳) دیوان راسخ محمد عبدالرحمن راسخ، فضل المطابع، دہلی، ۱۸۹۶ء ص ۳۴۷

(۴۴) گلزار داغ، داغ دہلوی، محمد تیغ بہادر لکھنؤ ۱۸۷۹ء، ص ۳۱۲

(۴۵) مہتاب داغ ص ۲۳۳

(۴۶) یادگار داغ ص ۲۳۳

(۴۷) ایضاً ص ۲۳۹

(۴۸) مہتاب داغ ص ۹۱۹

❁❁❁